Attribution-NonCommercial 4.0 International (CC BY-NC 4.0)
DOI No. doi.org/10.57156/bazyaft4317423

مصنف: پسِ ساختیاتی کلامیہ

(اور انتظار حسین کے تحفظات)

ڈاکٹر خرم شہزاد☆

☆اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اردو، گورنمنٹ گریجویٹ کالج قادر پور راں، ملتان

ABSTRACT:

This article begins by discussing the author's intention in relation to Russian formalism and new criticism, and then proceeds to explore the ideas about the author in post-structuralist discourse. It alludes to the social, political, and philosophical aspects of the differences between Western and Urdu criticism on this matter. Intizar Hussain, an important Urdu writer, expressed reservations in this regard, so his concerns are presented alongside a detailed analysis of the views of Roland Barthes, Jacques Derrida, and Michel Foucault. This is done to clarify the author's concept in the words of these Western intellectuals and to elucidate the nature of the concerns raised by the Urdu writer.

Key words: Roland Barthes, Michel Foucault, Jacques Derrida, Intizar Hussain, Author, Text, Reader, Discourse, Post Structuralism.

ادبی تنقید کی روایت میں (معنی کا اہم ماخذ ہونے کی وجہ سے) مصنف کو ہمیشہ ایک اہم مقام حاصل تھا۔ تاہم اس حوالے سے مغرب میں بیسویں صدی کا چھٹا عشرہ، ایک نئے موڑ کی حیثیت رکھتا ہے کیوں کہ رولاں بارت(Roland Barthes)، مشل فوکو(Michel Foucault)اور ژاک دریدا(Jacques Derrida) نے متن سے مصنف کی علیحدگی کو پسِ ساختیاتی کلامیے (Discourse)میں ڈھال دیا۔ مختلف دلائل کی بنیاد پر انہوں نے مصنف کی اُس حیثیت کو بے دخل کر دیا جو ہمیشہ سے ادبی تنقید میں معنی کا حوالہ سمجھی جاتی تھی۔ یہاں یہ

بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ متن کو مصنف سے علیحدہ کرنے کی باقاعدہ کوششوں کا آغاز تو روسی ہیئت پسندی (Russsian Formalism) سے تعلق رکھنے والے اذہان نے ۱۹۱۰ میں، جب کہ نئی تنقید (New Criticism) سے متعلق ناقدین نے ۱۹۴۰ میں کر دیا تھا اور اول الذّکر نے ادب کی ادبیت اور موخر الذکر نے قاری کی اہمیت کو اجاگر کرنے کی غرض سے متن پر مصنف کی بالادستی کو ختم کر دیا۔ تاہم اس ذیل میں ان کاوشوں کو وہ مقام نہ مل سکا جو پسِ ساختیاتی فکر سے موسوم مغربی اذہان کے ہاتھ آیا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ پسِ ساختیاتی کلامیے میں مصنف کے منشا کو فلسفیانہ تناظر میں بے دخل کیا گیا تھا جب کہ مذکورہ بالا دونوں تنقیدی منطقوں میں مصنف کے ارادے یا منشا کو ادبی تنقید میں، ایک اہم ضرورت کے طور پر موضوع بنایا گیا تھا۔ چناں چہ استدلال کے اس فرق کی بنا پر روسی ہیئت پسندی یا نئی تنقید جیسے ادبی دبستان، متن سے مصنف کی موجودگی کو مکمل طور حذف نہ کر سکے۔ اس بات کی وضاحت کے لیے نئی تنقید سے وابستہ امریکی نقادوں ولیم کے ومسٹ جونئیر (William K Wimsatt Jr.)، اور منروَسی بیئرڈسلی (Monr oe C. Beardsley) کی جانب سے مشترکہ طور پر لکھے گئے مضمون: "The Intentional Fallacy" کو دیکھا جا سکتا ہے۔ متن سے مصنف کے منشا کو علیحدہ کرنے کی ابتدائی کاوش سمجھے جانے والے اس مضمون میں مصنف کے منشا کو مغالطہ قرار دیا گیااوراس نتیجے تک پہنچنے کے لیے مغرب کے مختلف ادبی نقادوں کے اقتباسات کو نقل کرنے کے بعد یہ دکھایا گیاہے کہ مصنف، معنی کا ماخذ نہیں ہے بلکہ متن میں موجود جمالیاتی پہلو اور جس صنف میں متن لکھا گیا ہے اس کی شعریات ہی متن میں معنوں کو متعین کرتی ہیں۔ چناں چہ ادبی فن کے اعتبار سے مصنف کے منشا کو کامیابی کا معیار نہیں سمجھا جا سکتا۔ (William K Wimsatt Jr. & Monroe C. Beardsley 1954,03)

مذکورہ بالا رائے کی بنیاد پر کہا جا سکتا ہے کہ یہاں متن میں موجود جمالیاتی پہلوؤں اور شعریات کی وجہ سے مصنف کے منشا کو ادبی معیار کے درجے سے ہٹایا جا رہا ہے۔ تاہم اگر اس بے دخلی کا موازنہ، مصنف کے حوالے سے قائم ہونے والے پسِ ساختیاتی کلامیے (جس کا تفصیلی مطالعہ آگے آئے گا) سے کیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ یہ کوشش فلسفیانہ اقلیم میں نہ ہونے کے سبب نہایت سرسری ہے کیوں کہ جن دو عوامل یعنی متن کے جمالیاتی پہلو اور شعریات کو یہاں معنی کا سرچشمہ بتایا جا رہا ہے وہ پہلے بھی کسی نہ کسی صورت میں معنی کو قائم کرتے آئے ہیں۔ اس ضمن میں تعبیریت یا علمِ تفسیر (Hermeneutics) کو بطور مثال پیش کیا جا سکتا ہے البتہ پسِ ساختیات کے زمرے میں قائم ہونے والا مصنف کا کلامیہ (Discourse) ژاک دریدا، رولاں بارت اور مشل فوکو کے ہاں منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں کہا جائے تو پسِ ساختیاتی فکر نے متن سے سوانحی، تاریخی اور روایتی سماجی

حوالوں کو ہی منہا نہیں کیا تھا بلکہ اس نہج سے متن کی وہ حیثیت سامنے آگئی جسے مصنف کے منشا اور موجودگی نے قاری کی نظروں سے اوجھل کر رکھا تھا۔ یعنی یہاں ادب کی ادبیت سے زیادہ متن کی متنیت کا معاملہ زیرِ غور آیا۔ گویا اس فلسفیانہ منطقے میں مصنف کے معاملے کو زیادہ نازک سمجھا گیا اور انقلابی بنیادوں پر زبان میں موجود معنی آفرینی پر اصرار کیا گیا جس کے لازمی نتیجے کے طور پر مصنف (استعاراتی معنوں میں) موت سے ہم کنار ہو گیا۔ (Qasim Yaqoob 2017, 206)

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ لکھت میں سے لکھنے والے کو خارج کرنے یا خواہ استعاراتی معنوں میں ہی سہی آخر مردہ قرار دینے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ اس کا تعلق مغرب کے فلسفیانہ اور سماجی وسیاسی تناظر سے ہے کیوں کہ وہاں مصنف ایک ایسا تصور ہے جس نے انگریزی فلسفہ نتائجیت (Empiricism) اور فرانسیسی فلسفہ عقلیت (Rationalism) کے بطن سے جنم لیا اور ادبی تنقید میں اسے منطقی اثباتیت (Positivism) کے علاوہ سرمایہ دارانہ (Capitalist) نظریے نے جواز فراہم کیا۔ اس حوالے سے رولاں بارت کے الفاظ یہ ہیں:

> "مصنف ہمارے معاشرے کا ایک جدید تصور ہے۔ یہ ہماری اس معاشرت کا نتیجہ ہے جو انگریزی فلسفہ نتائجیت (Empiricism)، فرانسیسی فلسفہ عقلیت (Rationalism) اور ذات کے تجدید ایمان (Faith of Reformation) کے ساتھ قرونِ وسطیٰ میں ظاہر ہوئی۔ اسی نے ذات کے ایک ایسے وقار کو دریافت کیا جو انسانی تشخص پر منتج ہوا۔ چناں چہ منطقی اعتبار سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ادب کے اندر اثباتیت (Positivism) اور سرمایہ دارانہ آئیڈیالوجی کا نچوڑ اور نقطہ عروج، یہی تصور تھا جو، مصنف کی ذات کو غیر معمولی اہمیت دینے سے منسلک ہو گیا۔" [Roland Barthes 1977, 142-143]

اس رائے میں با آسانی دیکھا جا سکتا ہے کہ اول تو وہ مصنف جس کی موت کا اعلان رولاں بارت نے کیا تھا اس کا تصور، مغربی سماج میں پروان چڑھا۔ اس کے علاوہ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اس نے مذکورہ تصور کو سرمایہ دارانہ آئیڈیالوجی کے نچوڑ اور نقطہ عروج سے تعبیر کیا یعنی اس تصور کو انتہائی حتمی حوالے کے طور پر موضوع بنایا۔ چناں چہ یہ بات قابلِ غور ہے کہ پسِ ساختیات سے متعلق اذہان نے انسانی فکر کے ہر حتمی حوالے کو قابلِ تنقید سمجھا تھا اور بارت کے ہاں اس تنقیدی عمل کا آغاز مصنف سے ہوا۔ اس کے متعدد اسباب ہیں جنھیں اس بحث میں پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے۔

۱۔ دو عالمی جنگوں میں حصہ لینے والی مختلف اقوام کا تعلق دنیا کے اس خطے سے تھا جس کا علمی ورثہ مشترک ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رولاں بارت نے مصنف کے تصور کی بنت میں بہ یک وقت انگریزی اور فرانسیسی فلسفوں کو موضوع بنایا ہے۔ اس کے علاوہ اگر اس ضمن میں بارت کی رائے تک محدود نہ ہوا جائے تو جرمن اور روسی فلسفوں کے ساتھ ساتھ ان کی عملی جہت (Praxis) یعنی مارکسزم کو بھی بطور مثال پیش کیا جاسکتا ہے۔ چناں چہ عالمی جنگوں کو علمی اور فکری سطح پر پیدا ہونے والے بحران سے موسوم کیا جائے گا۔

۲۔ چوں کہ پسِ ساختیات نے کلیت (Totality) اور حتمی حوالوں کو قائم کرنے والے ہر ضابطے کو روایتی فکر سے موسوم کرنے کے بعد بے دخل کر دیا اس لیے مصنف سرِ فہرست رہا۔

۳۔ ۱۹۶۸ کے دوران مئی کا مہینہ بظاہر طلبا جماعتوں کے احتجاج جیسے معمولی واقعے کی نسبت سے یاد کیا جاتا ہے مگر اس واقعے کی مختلف جہتوں کا مطالعہ بتاتا ہے کہ ان احتجاجی مظاہروں نے فرانس کے (اس وقت کے اہم اذہان (Jacques Derrida & Mourizio Ferraris 2001, 50) کو روایتی اقدار اور تحکمانہ نظریات کے بارے میں از سرِ نو غور و فکر کی دعوت دی۔

۴۔ ۱۹۵۵ میں الجیریا (Algeria) نے فرانس سے آزادی حاصل کرنے کے لیے باقاعدہ کوششوں کا آغاز کیا۔ جس کے نتیجے میں فرانس نے ۱۳۲ سالوں تک غلام رکھنے کے بعد بالآخر ۱۹۶۲ میں اس کی آبادی سے دست برداری کا اعلان کر دیا۔ سو مصنف کی اجارہ داری کے خاتمے کی نسبت (بیسویں صدی کے چھٹے عشرے) میں ہی رونما ہونے والے اس واقعے کی اہمیت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا۔

درج بالا نکات کی مدد سے ان فکری عوامل کو سمجھا جاسکتا ہے جو فرانس میں پسِ ساختیات کی بنیاد بنے۔ چوں کہ علمی سطح پر پیدا ہونے والا بحران؛ انسانی فکر کی حتمی بنیادوں سے بیزاری؛ مختلف تنظیموں کی جانب سے احتجاجات اور آبادیوں سے دستبرداری (Decolonization) ایسے واقعات ہیں جو مغرب میں فرانس تک محدود نہیں تھے اس لیے پسِ ساختیاتی فکر نے مغرب بھر کے اذہان کو متوجہ کیا۔ تاہم اس نئے منطقے میں مذکورہ جاذبیت کو یورپ تک محدود نہیں سمجھا جاسکتا بلکہ ان فکری زاویوں کے نئے پن نے دنیا کے غیر مغرب خطوں سے تعلق رکھنے والے دانش وروں کو بھی متاثر کیا۔ چناں چہ اردو زبان میں نئی بحث کا آغاز ہو گیا۔ حالاں کہ مصنف کی موت کو من و عن قبول کرنے سے قبل مندرجہ ذیل سوالات پر غور کرنا ضروری تھا۔

۱۔ کیا اردو دنیا میں مصنف کے تصور کو قائم کرنے میں نتائجیت، عقلیت اور ذات کے حوالے سے تجدیدِ ایمان جیسے فلسفوں نے کردار ادا کیا تھا؟

۲۔ کیا اردو دنیا میں انسان کا وہ تصور قائم ہو چکا ہے جو مغرب میں احیائے علوم کی تحریک (Renaissance) کے دوران پروان چڑھا؟

۳۔ کیا اردو دنیا کے پاس بھی عالمی جنگوں کے نتیجے میں پیدا ہونے والا کوئی ایسا بحران ہے جس کا تجربہ (علمی سطح پر) مغرب کو ہوا تھا؟

۴۔ کیا اردو دنیا سے متعلق خطوں کے پاس کسی آبادی سے دست برداری کا تجربہ ہے؟

اگر ان سوالوں کا جواب نفی میں ہے تو دوسرے لفظوں میں اس کا مطلب یہ ہو گا کہ اردو دنیا تو ابھی مصنف کے اس تصور سے بھی ناواقف ہے جو رولاں بارت کے ہاں روایتی تصور سے موسوم ہو رہا تھا۔ تاہم اس اعلان کے نئے پن کی بدولت اردو کے ادیبوں کی توجہ بھی اس جانب مبذول ہوئی اور ایک اہم کہانی کار (انتظار حسین) نے اس بارے میں رائے دی:

> ”نئی ادبی تھیوری ادیب کو یہ حق نہیں دیتی کہ وہ کسی کتاب کا مصنف ہونے کا دعویٰ کرے یا یہ کہ وہ کسی ادب پارے، کسی نظم، کسی کہانی یا کسی ناول کا تخلیق کار ہونے کا اعلان کرے۔ اس کے تمام قارئین کو یہ حق ہے کہ خود اسی کی طرح اس فن پارے کے مصنف ہونے کا دعویٰ کر سکیں۔ یہاں مجھے وہ مثل یاد آتی ہے کہ دکھ بھریں بی فاختہ اور کوے انڈے کھائیں۔ اُس کرب کا بھلا کون اندازہ کر سکتا ہے جو ایک فن پارے کی تخلیق میں مصنف کی جان پر گزرتا ہے۔“[Zamir Ali Badayuni 2006, 110]

درج بالا رائے میں مصنف کی حیثیت سے پیش کردہ موقف کی بنیاد پر با آسانی سمجھا جا سکتا ہے کہ نئی ادبی تھیوری یعنی پس ساختیات میں جاذبیت تو تھی البتہ اس نے مصنفین کو مختلف وسوسوں میں مبتلا بھی کر دیا۔ اگرچہ مذکورہ تحفظات کو دور کرنے کی ہر ممکن کوشش ہوئی(Zamir Ali Badayuni 2006, 98) تاہم اردو نقاد، کہانی کار کو اپنی رائے بدلنے پر آمادہ نہ کر سکا۔ اس عدم آمادگی کی صریحاً وجہ تو یہی قرار دی جا سکتی ہے کہ پس ساختیات ایک بدیسی منطقہ ہے اس لیے 'تخلیق کار' اپنی رائے بدلنا نہیں چاہتا۔ البتہ یاد رکھنا چاہیے کہ وہی مصنف، اردو ادب کے فروغ میں مارکسیت، جدیدیت اور وجودیت جیسے بدیسی نظریہ ہائے ادب کا بھی قائل ہے۔(Zamir Ali Badayuni 2006, 96) تو اس کا مطلب یہ لیا جا سکتا ہے کہ نئی ادبی تھیوری کے حوالے سے 'تخلیق کار' کے ہاں پائی جانے والی عدم آمادگی کے اسباب کچھ اور ہیں۔

اس کی پہلی قرینِ قیاس وجہ یہ ہے کہ مارکسیت کی ذیل میں آنے والی طبقاتی کشمکش ہو؛ جدیدیت کے ضمن میں موضوع بننے والی انسان مرکزیت یا وجودیت کے باب میں پیدا ہونے والی بیگانگی؛ تینوں ہی کا تعلق محض فلسفے سے نہیں بلکہ اس مشاہدے سے بھی ہے جو تخلیق کار کو بدیسی سیاق کا پابند نہیں رہنے دیتا۔ یعنی مذکورہ تینوں ادبی دبستانوں میں لکھنے والے کو ذات، سماج اور مخصوص مطالعے کے ساتھ ساتھ مشاہدے اور تجربے کے تال میل پر اکتفا کرنا تھا۔ جب کہ پسِ ساختیات کا تعلق فلسفیانہ اقلیم سے ہے۔ دوسرے لفظوں میں کہا جائے تو پسِ ساختیات کے زُمرے میں شمار ہونے والے تمام اذہان، مغرب میں ایسے فلسفیوں کے طور پر جانے جاتے ہیں جن کی فکر نے دوسرے شعبہ ہائے علم کے ساتھ ساتھ ادبی تنقید کو بھی متاثر کیا۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ اسی وجہ سے رولاں بارت جیسا ادبی نقاد بھی تنقیدی موقف کو فلسفیانہ تناظر سے ہی اخذ کرتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی ہو چکی ہے کہ پس ساختیات کا تعلق مغرب کی اس صورتِ حال سے ہے جو دوسری عالمی جنگ کے بعد فرانس اور پورے مغرب میں پیدا ہو گئی تھی۔ چناں چہ کہا جا سکتا ہے کہ اس بحث کے فلسفیانہ تناظر کو مدِ نظر رکھتے ہوئے، اس تنقیدی منطقے کو اردو دنیا سے متعارف کروانا، ناقدین کا کام تھا۔ کیوں کہ اس ادبی تھیوری کا تعلق مشاہدے کے بجائے، اس دانش ورانہ بحث سے ہے جس نے ہر حتمی حوالے کو ختم کرنے کی کوشش کی اور اس باب میں 'مصنف' کو نکتہ آغاز بنایا۔ تاہم انتظار حسین صاحب کی رائے میں جو نکتہ اٹھایا گیا وہ اپنی جگہ اہمیت رکھتا ہے یعنی کیا پسِ ساختیاتی فکر کے مطابق، مصنف اپنی تصنیف پر نام کے اندراج جیسے بنیادی حق سے محروم ہو جاتا ہے؟ اس سوال کا جواب تلاش کرنے کی غرض سے (بنیادی ماخذات کے تناظر میں) مصنف کی حیثیت پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ اس ضمن میں پہلا قابلِ ذکر دستاویز، رولاں بارت کا مضمون: "The death of the author" ہے۔ اس کے آغاز پر بالزاک (Balzac) کے متن: سارا سین (Sarrasin) کے کردار کا تعارف موضوع بنا ہے۔ جو کچھ یوں ہے:

> "اپنی ایک کہانی میں سارا سین بالزاک، عورت کے طور پر زنخے کو اس جملے میں موضوع بناتا ہے: یہ [زنخہ] اپنے ناگاہ اندیشوں، نامعقول خواہشات، جبلی خدشات، جوشیلی بے باکی، ہنگامہ خیزیوں اور لذت آمیز آگہی کے ساتھ، اپنی ذات میں عورت ہی تھا۔" [Roland Barthes 1977, 142]

بالزاک کے متن میں شامل اس تعارف نمارائے کی بابت بارت نے درج ذیل سوالات اٹھائے ہیں:

ا۔ کیا اس رائے کی بنیاد پر کہانی کا ہیرو، خود کو عورت کے بھیس میں چھپے ہوئے زنخے سے لا علم ظاہر کرنا چاہتا ہے؟

۲۔ کیا اس رائے کے ذریعے بالزاک، انفرادی حیثیت میں عورت کے فلسفے کو پیش کرنا چاہتا ہے؟

۳۔ کیا اس رائے میں، مصنف کے طور پر بالزاک نسائیت (Femininity) کے بارے میں ادبی نظریات کا اظہار کر رہا ہے؟

۴۔ کیا اس رائے میں آفاقی دانش کو سمو دیا گیا ہے؟

۵۔ کیا اس رائے کو رومانوی نفسیات کے تناظر میں دیکھنا چاہیے؟

درج بالا سوالات کو سامنے رکھ کر سمجھا جا سکتا ہے کہ تمام تر سوالات کی بنیاد مصنف کے ارادے پر ہے۔ مثال کے طور پر پہلے سوال پر غور کریں یعنی اگر قاری تسلیم کر لے کہ کہانی کا ہیرو خود کو زنخے سے لاعلم ظاہر کرنا چاہتا ہے تو دوسرے لفظوں میں اس کا مطلب ہو گا کہ اس کا التزام مصنف نے کیا ہے تاکہ واقعات کی ترتیب میں اس کی اپنی ضرورت پوری ہو سکے۔ اسی نہج سے دوسرا سوال بڑے واضح انداز میں مصنف کے ارادے کا غماز ہے یعنی تسلیم کر لیا جائے کہ مصنف کی نظر میں نسوانیت کا تعلق محض جسمانی تخفیف یا بڑھوتری کے بجائے مخصوص احساسات کی بالیدگی سے ہے۔ تیسرا سوال ادب میں پروان چڑھنے والی ایک اہم تحریک: نسوانیت (Feminism) سے بالزاک کی فکری آہنگی کو موضوع بنا رہا ہے۔ چوتھے سوال میں زنخے کے حوالے سے قائم ہونے والی شناخت کو ہمہ گیر اصولوں پر مرتب کیا جا رہا ہے یعنی مرد اور عورت جیسی شناختوں کا تعلق سماجی تشکیل سے ہے جب کہ عورت نما مرد کی بابت 'عورت ہی' جیسا تاکیدی لیبل، آفاقی یا ہمہ گیر دانش کا حوالہ ہے۔ پانچویں سوال میں یہ استفسار ہے کہ کیا مذکورہ تعارف کا انحصار رومانوی نفسیات پر ہے؟ گویا اگر مذکورہ کردار کے عقب میں رومانوی نفسیات کو تسلیم کر لیا جائے تب بھی یہاں مصنف ہی کا ارادہ کارفرما ہو گا۔ سو اس مقام پر پہنچ کر کہا جا سکتا ہے کہ ان سوالات کی مدد سے بارت نے معنی کے روایتی ماخذ (یعنی مصنف) کو مختلف تناظرات میں موضوع بنایا ہے۔ علاوہ ازیں کسی متن میں در آنے والے کردار کا اس کے مصنف سے کیا رشتہ ہے یہ بھی انھی سوالات کا موضوع ہے۔ البتہ ان سوالات کے بعد وہ (نسبتاً قطعی انداز میں) لکھتا ہے:

> ''کسی وجہ سے ہم کبھی معلوم نہیں کر پاتے کہ 'تحریر' تو ہر مبدے کے آغاز، ہر آواز کا انہدام ہے۔ مختلف اجزا کا مرکب ہونے کی وجہ سے یہ غیر جانب دار ہے۔ تحریر، ایک ایسی غیر ہموار جگہ ہے جہاں ہمارا موضوع (مصنف) پھسل جاتا ہے اور [زبان میں موجود] منہا کرنے کی صلاحیت کی وجہ سے (مصنف کی) تمام تر شناخت ختم ہو جاتی ہے۔ بلکہ [یوں کہنا چاہیے کہ] منہا

کرنے کا مذکورہ عمل تو مصنف کی شناخت سے ہی شروع ہوتا ہے۔" [Roland Barthes 1977, 142]

اس رائے میں با آسانی دیکھا جا سکتا ہے کہ مصنف کے روایتی تصور کے سبب، قاری اس بات کو بھول جاتا ہے کہ لکھنے کے عمل میں ہی نہیں بلکہ لکھی ہوئی صورت میں بھی تحریر ایک عمل ہے جو تمام تر خارجی عوامل یہاں تک کہ لکھنے والے کو بھی خود میں سے منہا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ زبان اس قدر طاقت ور کیسے ہو سکتی ہے جس کی وجہ سے اپنے استعمال کرنے والے کو ہی منہا کر دے۔ کم از کم زبان کے حوالے سے روایتی تصور میں تو ایسا ممکن نہیں کیوں کہ اس کے مطابق زبان ایک ایسا شفاف ذریعہ ہے جسے استعمال میں لا کر بولنے یا لکھنے والا اپنے معنی ادا کر رہا ہوتا ہے۔ مزید یہ کہ اس تصور کی رو سے لفظ براہِ راست ان اشیا سے معنی اخذ کرتے ہیں جن کی نمائندگی کر رہے ہوتے ہیں۔ یعنی لفظ: 'درخت' کو سنتے ہی معنی کا جو تصور اس شے کی صورت میں ابھرتا ہے وہی درخت ہے۔ گویا شے اور اس کی نمائندگی کرنے والا لفظ مل کر ہی معنی کا تصور ابھارتے ہیں۔ چناں چہ حوالے (reference) کی وجہ سے ہی لفظوں میں معنی متعین ہوتے آئے ہیں۔

معنی آفرینی کے باب میں معنی کے اس روایتی تصور کو سوئس ماہرِ لسانیات فرڈینڈ ڈی ساسیئر (Ferdinand de Saussure) نے بدل دیا اور یاد رکھنا چاہیے کہ بارت کے پیشِ نظر زبان کا یہی بدلا ہوا تصور تھا جس کی بنیاد پر دعویٰ کیا جا رہا ہے کہ زبان اپنے استعمال کرنے والے کو منہا کر سکتی ہے۔ چوں کہ مصنف کے باب میں زبان کے حوالے سے ایک غیر معمولی دعویٰ کیا گیا ہے اس لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ساسیئر کے اس تصور پر مختصراً روشنی ڈالی جائے جسے بارت نے بطور پس منظر استعمال کیا۔

ساسئیر نے لفظ کو نشان (Sign) کے طور پر موضوع بنانے کے بعد دو ضمنی حوالوں یعنی معنی نما (Signifier) اور تصورِ معنی (Signified) کے ساتھ نشان زد کیا۔ اس کے مطابق معنی نما، لفظ کی تحریری یا تقریری صورت ہے اور ہم دیکھ چکے ہیں کہ یہ ایک ایسا صوتی پیکر (Sound Image) تھا جسے (ساسیئر سے قبل) مادے یا موضوع ہی کی طرف اشارہ سمجھا جاتا تھا۔ البتہ ساسیئر نے اسے صرف موضوع ہی کی طرف اشارہ نہیں رہنے دیا بلکہ اسے تصور کا حوالہ بھی قرار دیا۔ البتہ اس میں مزید اس بات کا اضافہ کر دیا کہ معنی نما اور اس کا تصور دونوں ہی، فرق کی بنیاد پر قائم ہوتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں کہا جائے تو ساسئیر کے ہاں نشان کی شناخت دو ضمنی حوالوں سے قائم ہوتی ہے۔ پہلا حوالہ معنی نما ہے جو (تحریر یا تقریر، ہر دو صورتوں میں) فرق کی بنیاد پر اپنی شناخت

قائم کرتا ہے اور اس کے بعد دوسرے حوالے یعنی تصور کی طرف اشارہ کرتا ہے اور اس کی بنیاد بھی فرق پر استوار ہوتی ہے۔

مثال کے طور پر 'کتاب' کی پہچان فقط اسی نشان (کتاب) پر منحصر نہیں ہے بلکہ اس کی شناخت کا تعلق 'گلاب'، 'حجاب'، 'نصاب' اور 'حباب' وغیرہ سے بھی ہے۔ یعنی مذکورہ نشانات میں پہلے دو حروف کا فرق ہمارے اصل نشان (کتاب) کی شناخت کو قائم کرتا ہے۔ جس وقت یہ شناخت مکمل ہوتی ہے تب ذہن میں نشان کا تصور ابھرتا ہے تو اس کے قیام میں بھی اس شے کے متعلقات اثر انداز ہوتے ہیں۔ یعنی 'کتاب' اس لیے کتاب ہے کیوں کہ یہ کاپی، رجسٹر یا محض صفحات نہیں ہیں۔ اس مثال کی بنیاد پر کہا جاسکتا ہے کہ ساسیئر کے تصور کی رو سے نشان کے دونوں ضمنی حوالے یعنی معنی نما اور تصورِ معنی اپنی شناخت کو فرق کی بنیاد پر قائم کرنے کے بعد بامعنی نشان بن جاتے ہیں۔ یعنی ہم کہہ سکتے ہیں کہ کلیت میں نشان کی شناخت فرق سے عبارت ہے۔ جسے واضح کرنے کے لیے ساسیئر لکھتا ہے:

> "زبان میں صرف افراقات (Differences) ہوتے ہیں۔ اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ عام طور پر فرق کا انحصار مثبت اصطلاحات پر ہوتا ہے جب کہ زبان میں (چاہے ہم تصورِ معنی کی بات کریں یا معنی نما کی) ایسے افراقات ہوتے ہیں جو مثبت اصطلاحات سے بھی عاری ہیں۔ زبان، لسانی نظام سے قبل خیالات رکھتی ہے اور نہ ہی اصوات، تاہم زبان کے پاس ایسے تصوراتی اور صوتی افراقات ہوتے ہیں جنھیں لسانی نظام جاری کرتا ہے۔" [Ferdinand De Saussure 2011, 120]

ساسیئر کی رائے میں (معنی نما اور تصورِ معنی دونوں سطحوں پر) جن افراقات کی بات کی گئی ہے ان کا تعلق زبان کے اسی عمل سے ہے جس کی بنیاد پر رولاں بارت نے دعویٰ کیا تھا کہ زبان، لکھنے والے کو منہا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں کہا جائے تو (افراقات کی وجہ سے) لکھے ہوئے الفاظ کی تفہیم، مصنف کے ارادے سے ماورا ہو جاتی ہے اور اس سطح تک جا پہنچتی ہے جہاں لکھنے والا خود اپنے ہی اظہاری وسیلے یعنی زبان میں سے منہا ہو جاتا ہے۔

اب تک کی بحث کو سمیٹنے کی غرض سے کہا جاسکتا ہے کہ پسِ ساختیاتی کلامیے میں زبان کو معنی کی ادائیگی کا شفاف وسیلہ سمجھنے کے بجائے تقریر اور تحریر کی ایک ایسی صورت گردانا گیا جسے مصنف کے ارادے یا منشا تک محدود سمجھا جاتا تھا اور ساسیئر ایک ایسا ماہرِ لسانیات ہے جس نے نشانات کی سائنس کو موضوع بنا کر اس حد بندی کو توڑ دیا۔

البتہ ژاک دریدا کے لفظوں میں کہا جائے تو زبان میں معنی آفرینی کا معاملہ انتہائی نازک اور پیچیدہ ہے۔ مغرب کی فلسفیانہ روایت میں، تقریر اور تحریر کا رشتہ ضمیمہ جاتی منطق کا حامل ہے۔ یعنی تحریر کو تقریر کا ضمیمہ (Supplement) سمجھ لیا گیا۔ جس سے تحریر کا اصل مقام موضوع نہ بن سکا۔ اگرچہ ساسیئر نے روایتی لفظ سے نشان کا تصور، قدرِ مختلف انداز میں دریافت کیا مگر وہ بھی تقریر اور تحریر کے درمیان قائم شدہ ضمیمہ جاتی منطق کی بنا پر معنی کی بحث کو تصورِ معنی (Signified) تک محدود سمجھا۔ (Jacques Derrida 1997,30) چناں چہ ژاک دریدا نے نشان (Sign) کو مصنف کی موجودگی سے تعبیر کرنے کے بعد اس کے بجائے، لفظ کو نقش (Mark) کے عنوان سے موضوع بنایا۔ (Khurram Shehzad 2022, 72)

اس پس منظر کے ساتھ ژاک دریدا کے ہاں مصنف کا تصور نہایت دلچسپ ہو جاتا ہے۔ اس کے نزدیک مصنف ایک ایسی ہستی (Being) کا تصور ہے جو موجودگی کا حوالہ ہے۔ دوسرے لفظوں میں کہا جائے تو موجودگی سے اس کی مراد لفظ مرکزیت (Logocentrism) ہے اور لفظ سے مراد Logos ہے۔ جس کے حوالے سے حسبِ ذیل معنی گنوائے جاتے ہیں۔

اول: عیسائیت کی رُو سے خدا کی طرف سے بولا گیا لفظ

دوم: فلسفے کی رُو سے وہ عقل جو کائنات کی ساخت اور ارتقا میں جاری ہے۔

[Dr. Jameel Jalbi 1969, 1152]

اس تعریف کی بنا پر Logos کو عیسائی الٰہیات میں خدا سے منسوب، دلیل کے قیام کا ایسا اصول قرار دیا جا سکتا ہے جس کی ابتدا، خدا کی طرف سے بولے ہوئے لفظ کی وجہ سے ہوئی تھی۔ چناں چہ ژاک دریدا نے افلاطون سے آغاز پذیر مغربی فلسفے کو لفظ مرکزیت (Logocentrism) کے عہد کا فلسفہ قرار دیا۔ کیوں کہ اس عہد کے آغاز پر، زبان کی شناخت لفظ مرکزیت کے تحت قائم ہو گئی تھی اور معنی آفرینی کے حوالے سے مابعد الطبیعاتی شعور رائج ہو گیا تھا۔ گویا یونانی عہد میں نشان کا تصور، عیسائی الٰہیات کے نشان میں بدل گیا۔ (Jacques Derrida 1997, P.13)

مصنف کے حوالے سے ژاک دریدا کے موقف کو سمجھنے کی غرض سے لکھا جا سکتا ہے کہ مغرب میں لفظ کا تصور، عیسائی مذہب کے زیرِ اثر پروان چڑھا، جس کی وجہ سے مابعد الطبیعیات کی موجودگی (Presence of Metaphysics) اور اضدادی جوڑوں (Binary Opposition) کے مابین فوقیتی ترتیب (Hierarchy) کی حامل فکر وغیرہ۔ ایسے حوالے بن گئے جو ماورائی تصورِ معنی (Transcendental Signified) قائم کرتے

آئے ہیں۔ جس کی وجہ سے زبان کے عمل میں معنی آفرینی کا سلسلہ محدود ہو جاتا تھا۔ چناں چہ کہا جا سکتا ہے کہ دریدا نے مصنف کو ایک بنیادی مسئلے کے طور پر موضوع بنایا:

> ''مغرب کی تاریخ بھی مابعد الطبیعیاتی تاریخ کی طرح مختلف استعاروں اور مجازی معنوں میں، انھی لفظوں کی تاریخ ہے۔ اس (تاریخ) کے ثقافتی، سماجی اور سیاسی قالب (Matrix) میں موجودگی کے تمام تر معنوں کے ساتھ، ہستی کو موجودگی کے طور پر ہی متعین کیا گیا ہے۔ یہ واضح کیا جا سکتا ہے کہ بنیاد پرستی، اصول، یا مرکز سے تعلق رکھنے والے تمام نام، ہمیشہ سے ہی غیر مبدل موجودگی کی طرف سے تفویض ہوتے ہیں مثلاً جوہر، وجود، مادہ، موضوع، الوہیت، شعور، خدا، آدمی وغیرہ۔'' [Jacques Derida 2021, 05]

درج بالا رائے کے حوالے سے سمجھا جا سکتا ہے کہ یہاں تبدیل نہ ہونے والی موجودگی کا تعلق اس مابعد الطبیعیاتی شعور کا نتیجہ ہے جو معنی آفرینی کا بنیادی اصول سمجھا گیا۔ جوہر، وجود، مادہ، موضوع، الوہیت، شعور، خدا اور آدمی وغیرہ ایسے الفاظ ہیں جو ماورائی تصورِ معنی سے ہی مفہوم اخذ کرتے ہیں۔ یوں تو یہاں پیش کردہ ہر لفظ ہی تصور کی حیثیت رکھتا ہے اور تجزیے کا مطالبہ کرتا ہے تاہم مصنف کے کلامیے کی بحث میں 'شعور' خاص اہمیت کا حامل ہے کیوں کہ شعور ہی آواز ہے اور اس کی وجہ سے صوت مرکزیت (Phonocentrism) ایک مسئلہ بن جاتی ہے۔ اس بات کی وضاحت میں دریدا اپنی مثال دے کر لکھتا ہے کہ جب میں بولتا ہوں تو خیالات کی وضاحت کے دوران محض اپنی ہستی کو ہی پیش نہیں کر رہا ہوتا بلکہ شعوری سطح پر اپنے تصورات کی وضاحت بھی کرتا ہوں جس کی وجہ سے صرف معنی نما (Signifier) اور تصورِ معنی (Signified) ہم آمیز نہیں ہوتے بلکہ معنی نما بھی شفاف دکھائی دینے لگتا ہے۔ (Jacques Derrida 1981 A, 22) یہاں دریدا نے اظہاری وسیلے کے طور پر زبان میں شعور کی کارکردگی اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے مسئلے کو واضح کیا ہے۔ گویا اس التباس کو دکھایا ہے جس کی وجہ سے زبان کو شعور کے اظہاری وسیلے تک محدود سمجھ لیا جاتا ہے اور معنی آفرینی کے کھیل میں معنی نما کی کارکردگی نظر انداز ہو جاتی ہے۔ تقریر کو سننے یا تحریر کو پڑھنے والے کا مقصد محض ان خیالات تک رسائی حاصل کرنا، ہو جاتا ہے جنھیں زبان استعمال کرنے والے نے پیش کر دیا۔ دوسرے لفظوں میں کہا جائے تو اس طرح سے مصنف کو ایک ایسی ہستی کے طور پر تسلیم کر لیا جاتا ہے جس کے ارادے کی وجہ سے معنی نما شفاف معلوم ہوتا ہے اور زبان محدود معنوں کی ترسیل کا ذریعہ بن کر رہ جاتی ہے۔

اب تک کی بحث کو سامنے رکھ کر سمجھا جا سکتا ہے کہ رولاں بارت اور ژاک دریدا کے نزدیک زبان، معنی کی ترسیل کا اکہرا یا شفاف ذریعہ نہیں بلکہ ایک ہمہ جہت حقیقت ہے جو سماج پر محیط ہے۔ سو اس پر مصنف کی اجارہ داری کو ایک ایسا واہمہ قرار دیا جا سکتا ہے جو انسانی دانست میں مضمر، مطلق العنانیت (Totalitarian) کا نتیجہ ہے۔ یا یہ بھی کہا جا سکتا ہے چوں کہ زبان میں موجود معنی آفرینی کے سلسلے نہایت وسیع ہیں اس لیے انسان کی سہل پسند طبیعت نے کلی تفہیم تک رسائی کی غرض سے مصنف کے منشا اور مقصد کو معنی کا بنیادی حوالہ سمجھا۔ تاہم معنیاتی اقلیم میں مصنف کے قابلِ اعتراض کردار کے حوالے سے دیکھا جا چکا ہے کہ رولاں بارت کے نزدیک اس سب کی وجہ سرمایہ دارانہ آئیڈیالوجی کا نچوڑ یا نقطہ عروج ہے جب کہ ژاک دریدا کے مطابق اس کی وجہ مابعد الطبیعیاتی شعور یا موجودگی کی مابعد الطبیعیات ہے۔

اس مقام پر پہنچ کر (بالفرض) یہ طے کر لیا جائے کہ مصنف کا وجود، تحریر کے لیے یا تحریر کے لیے مصنف کی موجودگی خطرہ ہے۔ سو ہر دو صورتوں کی نزاکت کو سمجھنے کے بعد احتیاط کی جائے کہ مصنف یا اس کا ارادہ تحریر پر اثر انداز نہ ہونے پائے گا۔ تب بھی سوال پیدا ہوتا ہے کہ معنی کے باب میں اس طے شدگی کا دارومدار کس پر ہو گا؟ ژاک دریدا کے الفاظ میں (دلچسپ طور پر) اس طے شدگی کا تعلق، تقریر یا تحریر میں موجود غیر طے شدہ (Undecideable) مقام سے ہے۔ اس کی وضاحت کے لیے یونانی زبان کا لفظ فارماکان (Pharmakon) کا حوالہ آیا ہے۔ چوں کہ یہ لفظ دو سمتی (ambivalent) معنوں یعنی زہر اور تریاق کا بہ یک وقت احاطہ کرتا ہے اس لیے دریدا لکھتا ہے:

> "اگر فارماکان دو سمتیت کا حامل ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لفظ ایک ذریعہ ہے جس میں متضاد معنی دوبدو ہوتے ہیں۔ یہ لفظ ایک تحریک یا کھیل ہے جس میں دو مختلف سمتیں ہم آہنگ ہوتی ہیں۔ جیسا کہ روح / جسم، اچھائی / برائی، اندرون / بیرون، یادداشت / نسیان، تقریر / تحریر وغیرہ۔" [Jacques Derrida 1981 B, 127]

درج بالا رائے کی بنیاد پر سمجھا جا سکتا ہے کہ یہاں لفظ کو نشان ماننے کے بعد، لکھنے یا بولنے والے کے تصرف سے اسے آزاد کیا جا رہا ہے۔ اگر غور کیا جائے تو بظاہر عام سا نظر آنے والا مطالبہ اپنی نہاد میں صدیوں کی مسافت رکھتا ہے۔ سو یاد کرنا چاہیے کہ کیا لکھنے والا لکھنے کے عمل میں کسی ارادے سے محروم رہتا ہے یعنی وہ نہیں جانتا کہ اسے کیا لکھنا ہے؟ ظاہر ہے کہ اس سوال کا جواب اثبات میں نہیں دیا جا سکتا۔ تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ منشا یا ارادے کے بجائے قرات کا انحصار کس امر پر ہو گا؟ اس بارے میں ژاک دریدا کا نکتہ نظر کیا ہے؟ دراصل اس حوالے سے قرات کا

تعلق زبان میں موجود اعادے (Iterability) کی صلاحیت سے ہے۔ مگر قاری اسے نظر انداز کرنے کے بعد مصنف کے ارادے کو اہمیت دیتا ہے جب کہ معنی لفظوں کو دہرانے کی وجہ سے پیدا ہو رہے ہوتے ہیں نا کہ مصنف کے ارادے سے۔ اس بات کی وضاحت کے لیے ایک ایسے خط کی مثال دی جا سکتی ہے جس کا مخاطب مر چکا ہے تو کیا اس خط کو مکتوب الیہ اور مکتوب نگار، دونوں کی غیر موجودگی کے سبب سمجھا نہیں جائے گا؟ ظاہر ہے کہ اس بات سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا ہے کیوں کہ ہم جانتے ہیں کہ خط اگرچہ نجی دستاویز ہے لیکن زبان جاننے والا کوئی بھی اسے فقط اس بنیاد پر سمجھ سکتا ہے کہ وہ لفظوں کو دہرانے کی صلاحیت رکھتا ہے چناں چہ معنی پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ تاہم اس معنی آفرینی کے سلسلے کو قاری اپنی سہولت یا دانست کے پیشِ نظر قطع کرنے کا اختیار ضرور رکھتا ہے۔ البتہ غور طلب بات یہ ہے کہ پسِ ساختیاتی کلامیے میں سارا مسئلہ اسی انقطاع سے شروع ہوتا ہے۔ محض مصنف کی مراد یا اس کا ارادہ ہی معنیاتی سلسلے کو محدود نہیں کرتے بلکہ فرد کی حیثیت میں اس کے بہت سے ذیلی مسائل بھی انسانی دانست میں راسخ ہو چکے ہیں جن کی وجہ سے معنی محدود ہوتے ہیں۔ ان عوامل کی وضاحت میں مشل فوکو لکھتا ہے:

> ”مصنف [دراصل] معنیاتی وسعت کو محدود کرنے کا اصول ہے۔ جس کی وجہ سے مصنف کے روایتی تصور کو یکسر بدل دینا چاہیے۔ [البتہ] ہم دیکھ آئے ہیں کہ کس طرح ہم اس روایتی تصور کے عادی ہو گئے ہیں اور مصنف کو ایک ایسی کائنات کا موجد اور خوش اخلاق خالق سمجھتے ہیں جس میں معنی کی لامحدود اور لازوال دولت ہوتی ہے۔ ہم ایسا سوچنے کے عادی ہو گئے ہیں کہ مصنف دوسرے لوگوں سے مختلف ہوتا ہے اور تمام زبانوں سے ماورا رہتا ہے۔ جب کبھی لب کشائی فرماتا ہے تو بہتات کے ساتھ معنی رواں ہو جاتے ہیں۔“ [Michel Foucault 1984,118]

درج بالا رائے کی بنیاد پر سمجھا جا سکتا ہے اگرچہ مشل فوکو بھی مصنف کو بطور ہستی ہی ہدف بنا رہا ہے کیوں کہ مصنف کو فرد کے طور پر ہی معنی کا سرچشمہ مانا جاتا ہے چناں چہ مصنف کے مذکورہ تصور کو اس نے مصنف کے عمل (Author Function) میں بدل دیا۔ یہی وجہ ہے کہ نئے مصنف کے طور پر اس کے ہاں مصنف بطور فرد، زیرِ بحث نہیں آتا بلکہ ایک سماجی سرگرمی بن جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں کہا جائے تو بارت اور دریدا نے مصنف کو فرد کے طور پر موضوع بنانے کے بعد اس کے تسلط کو متن یا تحریر سے علیحدہ کیا تھا جب کہ فوکو نے مصنف کو کسی ایک ذات کے طور موضوع بنانے جیسے زاویے کو روایتی تصور ہی کی توسیع مانتے ہوئے، مصنف کو سماجی سرگرمی کے طور پر نشان زد کیا۔ فردِ واحد کا تصور (اس کے ہاں) معنیاتی وسعتوں میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ یہاں یہ سوال

پیدا ہوتا ہے کہ کیا پسِ ساختیاتی کلامیہ یا نئی ادبی تھیوری مصنف کو اس کی کتاب پر نام کے اندراج جیسے بنیادی حق سے محروم کر دیتی ہے؟ یعنی انتظار حسین صاحب کا اندیشہ درست تھا؟ اس اہم سوال کا جواب تلاش کرنے کی غرض سے فوکو کے ہاں موضوع بننے والے مصنف کے نئے تصور یا مصنف کے عمل پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کی وضاحت میں مشل فوکو کے ایک اہم شارع لکھتے ہیں کہ مصنف کا عمل ایک ایسے قانونی نظام سے وابستہ ہوتا ہے جو "جملہ حقوق محفوظ" جیسے قوانین کی صورت میں ملکیتی حقوق اور انحراف کرنے والوں کے خلاف ضابطے کی کاروائی جیسے ریاستی حوالے ہیں۔ (Tim Smith-laing 2018, 37) اس رائے کی بنیاد پر سمجھا جا سکتا ہے کہ بطور شخص، مصنف کا نام ضرور اسی کی کتاب پر مندرج ہوتا ہے البتہ اس کا انحصار ان تمام قوانین پر رہتا ہے جو اشاعتی اور ریاستی اداروں کی جانب سے بنائے جاتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں کہا جائے تو مصنف کا عمل طاقت کے کلامیوں سے ماورا نہیں ہوتا بلکہ مختلف کلامیوں کے ماتحت ایک کلامیہ ہی ہوتا ہے۔

مشل فوکو کے مطابق 'مصنف' ایک ایسا کلامیہ ہے جو طاقت کے مختلف کلامیوں کے زیرِ اثر مرتب ہوتا ہے۔ تاہم اس حوالے سے یہ نکتہ پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے کہ اس طرح سے مصنف کا عمل خود بخود مرتب نہیں ہو جاتا۔ یعنی اگر مصنف کا طاقت کے کلامیوں کی زد میں آنا، مجبورِ محض مان لیا جائے تو بہت سے ایسے مصنفین کے کام کو نظر انداز کرنا پڑے گا جنھوں نے مذکورہ کلامیوں سے انحراف کی راہ اپنائی۔ چناں چہ یاد رکھنا چاہیے کہ فوکو نے مصنف کے عمل کو ایک ایسی عقل سے موسوم کیا ہے جو نہایت نازک اور پیچیدہ عمل کا نتیجہ ہے۔ اگر دوسرے لفظوں میں کہا جائے تو مصنف محض طاقت وروں کا آلہ کار نہیں ہوتا کہ جس کی وجہ سے مصنف کے کام کو (کسی کے ایما پر) متن کو از سرِ نو مرتب کرنے والا ہی سمجھ لیا جائے۔ بلکہ مصنف کے عمل کا انحصار حقیقی لکھاری اور فکشن کے کرداروں کے مابین قائم ہونے والے فاصلے سے ہے۔ (Michel Foucault 1984, 112)

مشل فوکو کے اس موقف کو سمجھنے کی غرض سے لکھا جا سکتا ہے کہ یوں تو متن کا تعلق حقیقی لکھاری یعنی روایتی مصنف سے ہے تاہم متن کو صرف اسی سے منسوب نہیں کیا جا سکتا۔ کیوں کہ جب کوئی لکھاری فکشن لکھتا ہے تو اس کے ذہن کی اختراع سمجھے جانے ولے کرداروں کا تعلق ذہن کے بجائے سماج سے ہے۔ چناں چہ ان کرداروں کی وضع قطع اور مکالمے بھی طاقت کے مختلف کلامیوں کی وجہ سے ہی ضابطہ تحریر میں آتے ہیں۔ یعنی فوکو نے مصف کے حوالے سے گوشت پوست کے انسان تک محدود روایتی تصور کو کلامیے کے روپ میں دریافت کیا اور ادبی تنقید کے لیے مشل فوکو کی یہ دریافت اس قدر بارآور ثابت ہوئی کہ ایڈورڈ سعید (Edward Said) کی بالخصوص دونوں کتابوں *Orientalism* (1978) اور *Culture and Imperialism* (1993) کو اسی

تصور کی اطلاقی جہت کہا جا سکتا ہے۔ اس تصور کی اہمیت اور نیا پن اپنی جگہ سہی لیکن وہ سوال ابھی بھی بر قرار ہے جس کی بات انتظار حسین صاحب نے کی تھی یعنی اگر مصنف کو فرد واحد نہ سمجھا جائے تو اس 'کرب' کی حیثیت کیا ہو گی جو مصنف اپنی جان پر برداشت کرتا ہے؟ یعنی وہ کتابیں کہ جن میں مقتدر قوتوں کے کلامیے سے انحراف کی بدولت ان کے مصنفین کو عتاب کا نشانہ بنایا گیا۔ اس بدلی ہوئی صورت میں کیا اس کا کرب بے معنی ہو جائے گا۔ اس ضمن میں سگمنڈ فرائڈ(Sigmund Freud) اور کارل مارکس (Karl Marx)کے بارے میں مشل فوکو کی رائے خاص اہمیت رکھتی ہے:

> "فرائڈ محض *The Interpretation of Dreams* یا *Jokes and Their Relation to the Unconscious* کا اور مارکس صرف *Communist Manifesto* یا *Das Kapital* کا مصنف ہی نہیں ہے بلکہ کلامیے کے حوالے سے دونوں نے نامختتم امکان کو قائم کیا۔"[Michel Foucault 1984, 144]

مشل فوکو کی رائے کو سامنے رکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ کسی بھی مصنف کا کمال اس میں ہے کہ اس نے کون سے کلامیے کا ساتھ دیا۔ یہی بات اسے اس قدر اہم بنا دیتی ہے کہ بعد میں آنے والوں کے اضافے بھی اسی کی کاوش سے موسوم ہوں گے۔ اگر اس بات کی تفہیم میں کتاب کو موضوع بنایا جائے تو وہ 1955 میں شائع ہونے والی ہربرٹ مارکوزے (Herbert Marcuse)کی کتاب:*Eros and Civilization* ہو سکتی ہے کیوں کہ اس میں بہ یک وقت سگمنڈ فرائیڈ اور کارل مارکس کے کلامیوں سے فائدہ اٹھانے کے بعد ایک نیا کلامیہ مرتب کیا گیا ہے۔ اس کتاب کے مندرجات کیا ہیں یا اس نئے کلامیے کی حیثیت کیا ہے؟ کے برعکس ہمارے موضوع سے متعلق بات یہ ہے کہ فوکو کے ہاں مصنف کا تصور بتاتا ہے کہ فرائڈ اور مارکس کے دنیا سے چلے جانے کے بعد بھی ان کا اثر کلامیے کی صورت میں موجود ہے اور یہ مصنف کے اسی عمل کا نتیجہ ہے جو گوشت پوست کے انسانی تصورِ مصنف سے ماورا ہے۔

پسِ ساختیاتی کلامیے کے تناظر میں مصنف کے حوالے سے اب تک کی بحث میں اس قدر مواد جمع کر لیا گیا ہے کہ جس کی بنیاد پر انتظار حسین صاحب کے تحفظات پر قطعی انداز میں رائے دی جا سکے۔ چناں چہ کہا جا سکتا ہے کہ پسِ ساختیاتی کلامیہ مصنف کو کتاب پر مصنف کے خانے میں نام کے اندراج کا حق ضرور دیتا ہے مگر اس کے منشا کو متن میں معنی پر اثر انداز نہیں ہونے دیتا بلکہ نشانات، تحریر کی سائنس اور مصنف کا عمل وغیرہ ایسے حوالے ہیں جو متن میں موجود معنوں کو مصنف کے منشا سے آزادی دلاتے ہیں اور یہ قرات جیسی سرگرمی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ چناں چہ قاری کو بھی مصنف کے درجے پر فائز سمجھا جا سکتا ہے۔ اب رہا سوال اس کرب کا جسے مصنف نے محسوس

کیا تو اس بارے میں یاد رکھنا چاہیے کہ کرب کا تعلق محض مصنف کے تجربے سے نہیں بلکہ معنیاتی اقلیم سے ہے۔ جس کی وجہ سے دکھ ایک سانجھ بن جاتا ہے۔ بشرطے کہ اس کی ترسیل ہو جائے البتہ وضاحت طلب بات یہ ہے کہ یہاں اُبھرے معنوں کے حامل انسانی تجربے کی ترسیل کا ذکر نہیں کیا جا رہا بلکہ لفظوں میں معنی کی صورت، کرب کی مختلف حالتوں اور ان کے متعلقات کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے۔ دوسرے لفظوں میں کہا جائے تو کرب کا تعلق محض مصنف کی ہستی سے نہیں ہے بلکہ انسانی تجربے کے تمام تر امکانات، افراقات (Differences) اور کلامیوں کے زیرِ اثر پروان چڑھنے والے تجربات سے بھی ہے۔ تاہم بآسانی سمجھا جا سکتا ہے کہ انتظار حسین صاحب کا اصرار جس کرب پر تھا اس کا تعلق مصنف کے ذاتی تجربے تک محدود ہے۔

اب تک کی بحث کو سمیٹنے کی غرض سے لکھا جا سکتا ہے کہ یوں تو اردو تنقید کا سیاسی، سماجی اور ثقافتی سیاق مغربی دنیا سے مختلف ہے مگر مصنف کا تصور (اپنی حتمی شکل کے اعتبار سے) بہت سی مماثلتیں رکھتا ہے بلکہ یہاں تک لکھا جا سکتا ہے کہ بعض صورتوں میں مغربی تصور سے بھی زیادہ حتمی ہے۔ اس لیے دنیا کے ان خطوں میں بھی مصنف کے تصور کو زیرِ بحث لانے کی ضرورت ہے تاکہ متن سے انصاف ممکن ہو۔ پسِ ساختیات سے منسلک مغربی فکر کا مطالعہ بتاتا ہے کہ ہر ذہن مختلف زاویوں سے مغرب کی فلسفیانہ روایت کا محاکمہ پیش کر رہا تھا۔ اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ یہ ادب میں تنقیدی بحث کی ایک ایسی قسم ہے جس کی اساس مغرب کے فلسفیانہ نظام پر ہونے کے باوجود خود اس نظام سے ماورا بھی ہے۔ چناں چہ ضروری تھا کہ اس بحث کو اس کے اصل سیاق کے حوالے سے متعارف کروانے جیسے، بنیادی تقاضے کو نبھایا جاتا۔ تاکہ اردو لکھاریوں کو ان افکار سے مطابقت یا عدم مطابقت تلاش کرنے میں سہولت رہتی۔

حواشی و مصادر:

- Dr. Jameel Jalbi. *Qoumi Angrezi Urdu Lughat.* Islamabad: Muqtadra Qoumi Zaban, 1969.

"In language there are only differences. Even more important: a difference generally implies positive terms between which the difference is set up; but in language there are only differences without positive terms. Whether we take the signified or the signifier, language has neither ideas nor sounds that existed before the linguistic system, but only conceptual and phonic differences that have issued from the system."

- Ferdinand De Saussure. *Course In General Linguestics*, trans. by Wade Baskin, edited by Perry Meisel and Haun Saussy. New York: Columbia University Press, 2011.

“If the pharmakon is "ambivalent", it is because it constitutes the medium in which opposites are opposed, the movement and the play that links them among themselves, reverses them or makes one side cross over into the other (Soul/body, good/evil, inside/outside, memory/forgetfilness, speech/writing, ets.)”

- Jacques Derrida. *Positions* trans. by Alan Bass. Chicago: The University of Chicago Press, 1981a.
- Jacques Derrida. *Dissemination*, trans. by Barbara Johnson. London: The Athlone Press, 1981 b.
- Jacques Derrida. *Of Grammatology*, trans. by Gayatri Chakravorty Spivak, 2nd Edition. Baltimor & London: The Johns Hopkins University Press, 1997.
- Jacques Derrida & Mourizio Ferraris. *A Taste for the Secret*, Trans. by Giacomo Donis. Cambridge: Polity Press, 2001.
- Jacques Derrida, "Structure, Sign and Play in the Discourse of the Human Sciences" (Translation and Illustration) Urdu Trans. by Khurram Shehzad, *Meyar* 13, no. 1 (October 2021): 1-31.
- Khurram Shehzad. *Jacques Derrida Ka Tehreer Asas Falsfa*. Karachi: City Book Point Publishers, 2022.

"The author is the principle of thrift in the proliferation of meaning. As a result, we must entirely reverse the traditional idea of the author. We are accustomed, as we have seen earlier, to saying that the author is the genial creator of a work in which he deposits, with infinite wealth and generosity, an inexhaustible. World of significations. We are used to thinking that the author is so different from all other men, and so transcendent with regard to all languages that, as soon as he speaks, meaning begins to proliferate, to proliferate indefinitely."

"Freud is not just the author of The Interpretation of Dreams or Jokes and Their Relation to the Unconscious; Marx is not just the author of the Communist Manifesto or Das Kapital: they both have established an endless possibility of discourse."

- Michel Foucault. *Foucault Reader*, edited by Paul Rabinow. New York: Pantheon Books, 1984.
- Qasim Yaqoob. *Lafz aur Tanqeed-Ma’ni.* Islamabad: Poorab Acadmy, 2017

"In his story Sarrasine Balzac, describing a castrato disguised as a woman, writes the following sentence: 'This was woman herself, with her sudden fears, her irrational whims, her instinctive worries, her impetuous boldness, her fussings, and her delicious sensibility."

"We shall never know, for the good reason that writing is the destruction of every voice, of every point of origin. Writing is that neutral, composite, oblique space where our subject slips away, the negative where all identity is lost, starting with the very identity of the body writing."

"The author is a modern figure, a product of our society insofar as, emerging from the Middle Ages with English empiricism, French rationalism and the personal faith of the Reformation, it discovered the prestige of the individual, of, as it is more nobly put, the 'human person'. It is thus, logical that in literature it should be this positivism, the epitome and culmination of capitalist ideology, which has attached the greatest importance to the 'person' of the author."

- Roland Barthes. *Image, Music, Text*, Trans. by Stephen Heath. London: Fontana Press. 1977.

- Tim Smith-laing. *Michel Foucault's What is an Author?* New York: Routledge, 2018.
- William K. Wimsatt Jr. & Monroe C. Beardsley. *The Verbal Icon*. Lexington, KY: The University Press of Kentucky, 1954.
- Zamir Ali Badayuni. *Mabaad Jadeediat Ka Dusra Rukh*, Trans. By Mubeen Mirza. Karachi: Scheherzad Publishers, 2006.